فضل حمید

کائنات کا باطنی نظام

تقدمِ باطن:

عالم کون و فساد و کارگاہِ تعینات اشباح و مثال میں ہر شے اپنے ظہور سے پہلے اپنے باطن میں موجود ہوتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر کسی شے کی حقیقت اس کا باطن ہے اور عالم رنگ و بو میں اس کا اظہار مجاز کا اعتبار رکھتا ہے۔ نہ باطن کے بغیر ظاہر کا کوئی برگ و ساز ہے نہ ظاہر کے بغیر باطن کا کوئی منشاء و مواد آب و گل کے عالم کیف و کم میں صورت کا امکان رکھتا ہے۔ اس لیے اس تقابلی فضائل کی دنیا میں جسے ہم عالمِ شہادت سے تعبیر کرتے ہیں، باطن کے فرق مراتب و مدارج تفوق کا سلسلہ برپا ہے۔ ذٰلك تقدیر العزیز العلیم۔

باطن حقیقت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے لیکن نظام کائنات کی جلوہ گاہ توفیق و استعداد میں باطن کی تحریک اپنی قوتِ قاہرہ کے باوصف پوشیدہ رہتی ہے اور ظاہر کے مراتب کیف و کم کا احساس ہر ذی شعور فرد انسانی کو ہوتا ہے۔ لیکن معنی شناس نگاہیں باطن کے رموز و اشارات سے غافل نہیں رہتیں اور بطون و ظہور کے ہنگامہ میں ان کی قوتِ مدرکہ باطنی تقاضوں کو فراموش نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر درخت کا باطن اس کا تخم ہے اور بالقوہ سارا درخت اس میں مندمج ہوتا ہے اور آب و گل کی آبیاری سے نشو و نما پاکر درخت ثمر ور بن جاتا ہے۔

عالم کا ذرہ ذرہ توفیق و استعداد کی گیر و دار کا زندانی ہے اور وہی تدبیر کارگر ہوتی ہے جو منشاء تقدیر کے مطابق ہوتی ہے۔ البتہ کوئی مال یا جمال و کمال کی تحصیل تدبیر کی چارہ گری کے بغیر نہیں ہوتی۔ تقدیر دراصل استعداد و امکان کی قدرت کی آئینہ دار ہے۔ اندازہ اگر صحیح ہو تو نیلِ مرام کے لیے مفید ہے، غلط

ہو تو ناکامی و بدنصیبی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

وجود باری تعالیٰ:

ہر چند کہ وجود مطلق حق تعالیٰ ہے اور صوفیاءِ کرام کے نزدیک وہی ظاہر اور وہی باطنِ کائنات ہے۔ چنانچہ وہ قرآن حکیم کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن

۲۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض

۳۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید

۴۔ کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

لیکن عقلِ انسانی مخلوقات میں جو مشاہد و مرئی ہے، حق تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتی۔ البتہ انسان اپنے باطن کے نور یا صفائے نفس سے حق تعالیٰ کو محسوس کر سکتا ہے۔ یہی معنی ہیں اس ارشاد کے کہ عرفت ربی بربی۔ چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ:

الخلق معقول والحق محسوس — خلق معقول ہے اور حق محسوس ہے۔"

اثبات وجود باری تعالیٰ:

کائنات کی تعلیلی حکمتوں اور خیر و خوبی کی مصلحتوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نظم و نسق اور حسن تعمیر و ترکیب کا یہ عالم بغیر کسی صانع، خالق، رب کے جو جمال و کمال کی جملہ صفات سے متصف ہو، ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ صفات کا تصور بغیر موصوف کے اور اسماء کا تخیل بغیر مسمّٰی کے بے معنی ہے۔ ہر چند کہ عالم کون و فساد میں شکست و ریخت اور تعمیر و تزئین کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ عقلِ انسانی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ یہ تسلسل ابتدا و انشا کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ورنہ دور لازم آتا ہے جو محال عقلی ہے۔ حکمت ہے تو حکیم کا ہونا بھی ضروری ہے اور ربوبیت ہے تو رب کا وجود باجود بھی ناگزیر ہے۔ وہ ذاتِ بابرکات کیا ہے اور کیسی ہے یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔

لامکان کا حدود اربعہ کون متعین کر سکتا ہے۔ اس بے چون و چگون کی ہمہ گیری و ہمہ جائی مسلم ہے اور بس۔ کنہ ذات تک ہمارا پہنچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ محیط ہے اور ہم محاط۔ محاط محیط کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ وہ رب ہے اور ہم مربوب۔ مربوب رب کی حقیقت اسی قدر ملاحظہ کر سکتا ہے کہ اس کی

گوناگوں حکمتوں اور بوقلموں، ترکیبی مصلحتوں کا مشاہدہ اپنے نفس میں کرے۔ چنانچہ قرآن حکیم کہتا ہے:

وفی انفسکم ط افلا تبصرون — کیا تم اپنے نفوس کی حیرت انگیز ساخت پر غور نہیں کرتے۔ پ ۲۶۔ آخر

ہر گیاہے کہ از زمیں روید — وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اہل معرفت کی کثرت کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ نور بسیط ہے جس کا احساس انسان اپنے قلب یعنی باطن میں کر سکتا ہے۔ اس احساس کا تعلق وجدان اور ذوق صحیح سے ہے نہ کہ مدرکات عقلیہ سے۔

ربّ النوع:

فطرت کی ربوبیت ماحول کی موافقت و سازگاری اور اسباب معیشت اور وسائل معاش کی صورت میں ہر نوع مخلوقات کے لیے مہیا ہے۔ لیکن فطرت کا مزاج یہ ہے کہ وہ فرد کی ربوبیت اور بقا کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی کیونکہ انفرادیت کے بقا کے لیے کوئی خاص تمیز فطرت کے کاروبار کی وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ البتہ فطرت کا ایک عام اصول بقائے انفع کا ہے۔ نوع انسانی بلکہ انواع حیوانی و نباتاتی کے نفع کے لیے جو افراد خواہ افراد انسانی ہوں یا نباتاتی روئیدگی کے اجزاء ہوں کوشاں ہوتے ہیں، فطرت ان کی بقا کے لیے سہولت کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ قرآن کریم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ:

"جھاگ (یعنی بیکار حصہ) ضائع ہو جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچاتی ہے وہ باقی رہ جاتی ہے"

ہر ذی حیات حوادث کی زد میں ہے۔ لیکن انسان کو اس کی خلافت کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بہ قدر ظرف و استعداد تسخیر کائنات کی قابلیت عطا کی ہے اور آفات و بلیات سے محفوظ رہنے کے لیے شعور ارزانی فرمایا ہے۔ یہ شعور اور قابلیت تحفظ بھی اضافی اعتبارات ہیں۔ حدود و جہد و سعی کو ملحوظ خاطر رکھنا عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ لیکن بالآخر ہر انسان لقمۂ اجل ہو جاتا ہے۔ یہ ہر ذی حیات کی قضائے مبرم ہے۔ ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے!
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہ ہر کیف فنائے ظاہر سے فنائے باطن متصور نہیں۔ یہ توہم کی کار پردازی ہے کہ بقا ہے تو محض ظاہر کی ہے یا ظاہر و باطن دونوں کی فنا ہے۔ ثم الینا ترجعون کی آیت کریمہ سے فنائے باطن کی صاف طور پر نفی ہو جاتی ہے۔

بقائے فرد:

حب حیات نے افراد انسانی میں ظاہر یعنی جسمانی بقا کا توہم پیدا کر دیا ہے حالانکہ حقیقت شناسی کے اعتبار سے اس کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ موجودہ حیات مستعار کو بقا نہیں اور خودی جو ترکیب عنصری و جسمانی کا خاصہ ہے۔ اس کی بقا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تو نظم کا مقطع یہ ہے کہ ثم الینا ترجعون۔

معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا ظہور لبطون یعنی عالم شبح و مثال سے ہوا اور موت کے بعد اس کے بازگشت کی بھی یہی صورت ہے۔ قوت مثالیہ جو اپنے دامن میں لامحدود وسعتیں رکھتی ہے۔ آدمی کو عالم آب و گل میں لے آئی، جہاں ترکیب جسمانی اور ہیئت عنصری میں اس کی نشوونما ہوئی۔ قوت غاذیہ، قوت نامیہ اور دیگر قواکی وسعت گیری سے جو مظاہر ربوبیت ہیں۔ انسان اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچا ہے۔ بقول مولائے روم ؎

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام
ہمچو سبزہ بار بار روئیدہ ام

اس کیفیت عنصری میں ترکیب جسمانی سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی معراج نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر یہ تنبیہ فرماتے ہیں کہ:

لا تتعب نفسك فانها غائية ما فوقها غائية	اپنے نفس در روح حیوانی کو تعب میں نہ ڈال، یہ وہ غائت ہے جس کے مافوق کوئی غایت نہیں۔

تزکیہ و تصفیۂ نفس اور بات ہے جس کا تذکرہ اپنے محل و مقام پر آئے گا۔ البتہ جسم انسانی کے تحلیل ہو جانے یعنی موت کے بعد انسان کی نشوونما کا ساز و سامان کسی اور عالم میں ہوتا ہے اور یہ عالم مثال ہے۔ جہاں سے نشاۃ اولیٰ میں انسان آیا تھا اور تدریجاً مدتوں کی کشمکش اور نشوونما

کے سوز و ساز کے بعد جمادی، نباتی و حیوانی منزلیں طے کر کے اپنے موجودہ مقام پر پہنچا ہے۔ اب جب عالم باطن کی طرف رجوع کرے گا تو پھر شبیح و مثال کی نہ جانے کتنی منزلیں اسے طے کرنی پڑیں۔ تجدد امثال کا عمل جاری ہے اور یہ نئی مثالی کیفیت اپنے دامن میں ارتقار کی حقیقت کو سمیٹے ہوئے ہے اور مرنے کے بعد ایک نئی زندگی کے ساز کا زیر و بم شروع ہوگا۔

بقول مولانا رومی جس خدا نے اس ذرۂ حقیر کو انسانیت کے مرتبہ تک پہنچایا ہے کیا وہ آئندہ اسے ارتقار و ترقی کے برگ و ساز سے محروم کر دے گا؟

اس نشاۃ الثانیہ کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ تمہیں زندگی کا ایک نیا لباس (لبس جدید) ملے گا۔ لیکن اس نئی زندگی کے جمال و کمال اور خیر و خوبی کا انحصار اعمالِ صالحہ اور افعال خیریہ یعنے نفع رسانیٔ خلائق پر ہے۔ اس نئی زندگی کی تعمیر سونے چاندی یا سنگ و خشت اور شیشہ و چینی سے نہیں بلکہ مخلوق خدا کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک خوش اخلاقی اور مروت اور سخاوت اور معدلت گستری سے ہوگی۔ قرآن پاک ارشاد فرماتا ہے:

وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ھو خیرا واعظم اجرا

اور اس راہ میں سب سے بڑی بات بے آزاری ہے۔ بقول حضرت حافظ:

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ظہورِ خیر و شر:

ذاتِ حق مصدرِ خیرِ مطلق و منبع و مبدار جملہ صفات جمال و کمال ہے۔ لیکن ہیئت عنصری کا یہ ناگزیر تقاضہ ہے کہ اشیار اور صفات کا ظہور ان کے اضداد کی نمود کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کو تقابلی اضداد کا عالم کہتے ہیں۔ شر کے بغیر خیر کا مفہوم متعارف نہیں ہو سکتا اور ذمائم اخلاق کے تقابل کے بغیر فضائل اخلاق بے معنی ہیں۔ اس لیے جہاں مروت و کرم، رحمدلی اور عالی حوصلگی کی صفات حسنہ ہیں وہاں خست، بخل، سنگ دلی اور تنگ ظرفی کی صفات سیئہ و رذیلہ بھی جلوہ آرا رہیں۔ اور اسی تصادم خیر و شر سے اس جہانِ کیف و کم کا فروغ و اعتبار ہے۔

جبر و اختیار:

آدمی کے باطن کا جبر اس کے ظاہر پر ہے اور اس کے ظاہر کا جبر اس کے باطن پر ہے۔ یعنی صورت کے اعتبار سے اختیار ہے اور معنی کے اعتبار سے جبر۔ لیکن جبر کا تعلق خارج سے نہیں بلکہ خود انسان کے ظاہری و باطنی قوا سے ہے۔ چراغ عقل کی ہدایت سے تعدیل کی صورت نکل آتی ہے۔

ظاہر میں جو جبر خارجی طور پر محسوس ہوتا ہے وہ آدمی کے نفسی حالات اور گرد و پیش کے ناگزیر تقاضوں پر محمول ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنے ماحول کے ساتھ مناسبت و سازگاری پیدا نہیں کر سکتا تو اسے تکلیف و تکلف سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

تکلیفاتِ شرعیہ جہاں اور بہت سے فوائد و مصالح کی حامل ہیں وہاں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ انسان کے قوائے ذہنیہ و عملیہ جد و جہد اور سعیٔ نافع کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں اور غفلت اور کاہلی کے پردے دُور ہو جاتے ہیں۔

نیز باطن کی اصلاح ہو کر منکرات و معاصی سے اجتناب کی راہ استوار ہو جاتی ہے۔ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر اور عبادت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ کائنات کے حقائق کما حقہٗ معلوم ہو جائیں اور وہم و گمان کے اندیشہ ہائے دور و دراز جاتے رہیں۔ اصل چیز اصلاح باطن ہے اور اس کا بہترین ذریعہ اخلاق عالیہ اور اوصاف مرضیہ مثال کے طور پر جود و سخا اور لطف و کرم ہیں ؎

پندِ حافظ بشنو، اے خواجہ! بر و نیکی کن
زانکہ ایں پند بہ از دُر و گہر مے بینم

اسی بنا پر قرآن حکیم نے اجتماعی زندگی میں بھی نفسی اصلاح پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

عدمِ مساوات:

مساوات مطلق فطرت کے کاروبار میں نہیں ہے بلکہ درجہ بدرجہ عدم مساوات کا ایک سلسلہ برپا ہے۔ لیکن فطرت نے وسائل و اسباب حیات مثال کے طور پر آب و ہوا یا قوائے نشو و نما

بلا امتیاز مذہب وملت ورنگ ونسل یا طبقاتی فضیلت سب کو عطا فرمائے ہیں اور انسان کو وجدانی طور پر یہ شعور دیا ہے کہ وہ معاش اور ترقی کے وسائل کے معاملہ میں حتی المقدور مساوات قائم کرے۔ نظام کائنات کا یہ ناگزیر باطنی تقاضہ ہے۔ البتہ افراد کی ذاتی قابلیت و استعداد متفاوت ہے۔ تفاوتی فضیلتوں کے عالم میں افراد کی استعداد و قابلیت کی یکسانیت از قبیل محالات ہے لیکن فطرت کا باطنی اشارہ یہی ہے کہ مساوات و انصاف ومعدلت کی اساس پر کائنات کا نظم ونسق قائم ہو، اس کے خلاف عمل کوشی، ظلم وغضب کے مترادف ہے یعنی بے محل ہے اور طبقاتی تصادم کا باعث ہو جاتی ہے، فطرت کے باطنی کمال کا منشا امن وصلح ہے، جارحیت صرف تحفظ کے لیے جائز ہے۔ ہوس زر وزمین کے لیے یا جارحیت انسان کے اخلاق عالیہ اور انسانیت کے امن وامان کے تقاضوں کی صریح مخالفت ہے خصوصاً اس سائنسی دور میں کہ جراثیم اور ایٹمی اسلحہ کی جنگ انسانیت کی تباہی وبربادی کا موجب ہے ایسی تباہی وبربادی کا جس کے بعد بقائے نسل انسانی کا امکان باقی نہیں رہتا۔ افراد کی طرح اقوام کو بھی خودی وخود پرستی، غرور اور ضد وزبردستی سے مجتنب رہنا چاہیے۔